

اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کی اساس فقہی نظریات کا ایک تقابلی جائزہ

غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ اسلامی ریاست کے تعلقات کے احکام پر مشتمل مواد کو ہمارے فقہی لٹریچر میں ”سیر“ کے عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ جدید اصطلاح میں اسے ”الفقہ الدولی“ یا اسلامی قانون بین الاقوام (International Law) کہا جاتا ہے۔ غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ اسلامی ریاست کے تعلقات کی بنیاد امن ہے یا جنگ؟ آئندہ سطور میں اس سوال کا جواب ”سیر“ یا اسلامی قانون بین الاقوام کے جدید رجحانات کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلا نقطہ نظر

جمہور فقہانے، جن میں احناف کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، غیر مسلموں کے ساتھ اسلامی ریاست کے تعلقات کی بنیاد جنگ کو ٹھہرایا ہے۔ اس اصول کو علامہ سرخسی نے یوں بیان فرمایا ہے: ”الاصول فی العلاقات المسلمین بالكفار الحرب“ یعنی غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات میں اصل کی حیثیت جنگ کو حاصل ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے دنیا کی دو قطبی تقسیم کی ہے: ۱۔ دارالاسلام، ۲۔ دارالحرب ☆

غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات کے حوالے سے دنیا کی دوسری تقسیم شوافع اور ان کے ہم خیال فقہائے کرام کی

☆ فقہائے سلف جب دارالحرب اور دارالاسلام کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا مقصود دراصل اعتقادی یا نظریاتی تصورات کی تفریق کی نشان دہی کرنا ہوتا ہے یا مسلم دائرہ حکومت، دائرہ اختیار کی عمل داری کی حدود متعین کرنا ہوتا ہے۔ اس تقسیم کے پس منظر میں اسلام کی بالادستی کا وہ تصور بہر کیف نہ تھا جو موجودہ جہادی تحریکوں کا بالعموم ہے جس کے پیش نظر ساری غیر مسلم دنیا کو دشمن گردانا جاتا ہے، ہر غیر مسلم سے برسر پیکار رہنا ”مدہبی فریضہ“ ہے اور دنیا کی ان ساری اقوام کے لیے جو مسلمان نہیں، حق بقا اور علاقائی اقتدار اعلیٰ کا کوئی تصور نہیں۔

ہے جو دنیا کی تقسیم میں 'دارالعباد' یا 'دارالصلح' کا اضافہ کرتے ہیں تاہم ان کے نزدیک بھی یہ حصہ دراصل دارالاسلام ہی کے ماتحت ہے۔

حق یہ ہے کہ فقہائے اسلام کی یہ تقسیم حالات کی پیداوار ہے۔ یہ فقہی اجتہاد کا وہ زمانہ تھا جب اسلامی ریاست کو غیر مسلموں کی طرف سے ہمہ وقتی جنگ درپیش تھی اور امن اس میں ایک عارضی کیفیت کا درجہ رکھتا تھا۔ بقول ڈاکٹر وہبہ زحیلی، یہ کوئی منصوص تقسیم نہیں ہے بلکہ فقہائے کرام کے اس اجتہاد کا نتیجہ ہے جو انہوں نے حالات کے تناظر میں کیا تھا۔ ان حضرات نے حکمت عملی کے پیش نظر اور مسلمانوں کو متحرک رکھنے کی نیت سے جب غور کیا تو محسوس کیا کہ جنگ مسلسل چلی آ رہی ہے اور امن ایک عارضی کیفیت ہے۔ جنگ کو اصل قرار دینے کی وجہ ان حضرات کے نزدیک یہ تھی کہ مسلمان تو بلا جواز جنگ کے قائل ہی نہیں اور جنگ ہمیشہ غیر مسلموں ہی کی طرف سے مسلط کی جاتی رہی ہے اس لیے یہی اصل ہے۔ چنانچہ ان فقہائے کرام کے ہاں وہ تمام آیات منسوخ قرار پائیں جن میں غیر مسلموں سے حسن سلوک، معافی، غیر جانب داری، صلح، صبر و تحمل اور طریقہ حسنی کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ ان حضرات نے سورۃ التوبہ کی آیت ۳۶: 'وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً' (اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں) یا آیت ۲۹: 'فَقَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ' (اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روز آخرت پر) کو نسخ ٹھہرایا ہے۔ اس ضمن کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ سورہ ممتحنہ کی آیت کریمہ ہے:

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُواكُمْ فِي
الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُواكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ
تَبْرُوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
الْمُقْسِطِينَ ۝ (آیت ۸)

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں
لڑی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا، ان کے ساتھ سلوک
واحسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ
تمہیں نہیں روکتا، بلکہ اللہ تو انصاف کرنے والوں کو پسند
کرتا ہے۔

بصاف فرماتے ہیں کہ اسے سورہ براءۃ کی آیت ۵: 'فَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ' (مشرکین کو جہاں کہیں بھی پاؤ، قتل کر ڈالو) نے منسوخ کر دیا ہے۔

اسی طرح سورہ حشر کی آیت ۲: 'هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ' (وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے کافروں کو تمہاری پہلی ہی فوج کشی کے نتیجے میں ان کے گھروں سے نکال دیا) کے تحت بصاف نے یہود بنی نضیر سے نبی اکرم کی مصالحت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے:

”ہمارے نزدیک (مصالحت کا) یہ حکم منسوخ ہے..... نسخ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ اس

وقت تک لڑتے رہنے کا حکم دیا ہے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں یا جزیہ ادا کرنا قبول نہ کر لیں۔“

ان حضرات کے نزدیک غیر مسلموں سے دائمی صلح کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔ غرض ان فقہانے اصول نسخ کا مبالغہ آمیز استعمال کیا۔ قرآن کے جنگی احکام کے فہم میں تطبیقی طریق اختیار کرنے کے بجائے طریق نسخ استعمال کیا۔ آیت سیف سے ۱۴۰ آیات کو منسوخ قرار دے دیا۔ جہاد کی جارحانہ نوعیت پر زور دیا۔ جزیہ کو کفر کی سزا بلکہ کفر کا معاوضہ قرار دیا۔ پھر زمانہ تقلید کی تعبیر و تشریح نے جلتی پرتیل کا کام کیا جس سے اقوام عالم میں اسلام سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں نے جنم لیا۔

ان فقہانے نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ جہاد و قتال دراصل دعوت اسلام کا ایک ذریعہ ہے اور اسلامی دعوت کے دو ہی طریقے ہیں: زبان سے دعوت اور مشیر و سناں سے دعوت۔ کسی کو وعظ و ارشاد اور دعوت بالقول ہو جائے، وہ اسے تسلیم نہ کرے تو چاہے وہ پرامن رہے اور دعوت حق کے مقابلے میں رکاوٹ نہ بھی بنے، تب بھی اس کے لیے دعوت بالسیف اور قتال واجب ہو جاتے ہیں۔ دعوت کا یہ محدود مفہوم عملاً امت میں کسی نے بھی نہیں سمجھا نہ یہ قرآن کریم کے طریق دعوت ہی سے موافق ہے جس کی طرف قرآن نے اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں رہنمائی کی ہے۔ قرآن نے دعوت کو حجت و برہان، منطوق و عقل سے مزین کر کے پیش کرنے کا حکم دیا ہے:

أُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ
الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ
اے پیغمبر! لوگوں کو دانش اور اچھی نصیحت سے اپنے
پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے
طریق سے ان کے ساتھ مجادلہ کرو۔
(النحل ۱۲۵)

قرآن نے اکراہ اور جبر کو بطور وسیلہ اختیار کرنے کو حرام ٹھہرایا ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ
دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت
(صاف طور پر ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔
(البقرہ ۲۵۶)

کیونکہ دین کی اساس ایمان قلبی اور اختیار و اطاعت پر ہے۔ نیز پیغمبر کا منصب داروغہ کا نہیں بلکہ مذکر کا ہے:
فَذَكَّرْنَا نِمًا أَنْتَ مُذَكَّرٌ ۖ لَسْتَ عَلَيْهِمْ
بِمُصَيِّرٍ ۖ (الغاشیہ ۲۲:۲۱)
آپ نصیحت کر دیا کیجیے۔ آپ تو صرف نصیحت ہی
کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر کچھ مسلط تو نہیں ہیں۔

چنانچہ دعوت دین کے اس محدود تصور کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ قرآن کے نفی اکراہ کے تصور کے خلاف اور ایمان قلبی کی معنویت کو فراموش کرنے کے مترادف ہے۔

دوسرا نقطہ نظر

فقہائے کرام کا ایک گروہ اس نقطہ نظر کا حامل ہے کہ جنگ ایک عارضی کیفیت ہے کہ جب تک اس کے اسباب رہیں گے، جنگ رہے گی اور اسباب ختم ہونے پر یہ ختم ہو جائے گی۔ نیز غیر مسلموں سے تعلقات کی اصل صلح و امن ہے اور غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات قائم ہو سکتے ہیں اور غیر مخالفین یا غیر محارب اقوام کے ساتھ پر امن بقائے باہمی کی بات قرار پاسکتی ہے۔ فقہائے کرام میں اس نقطہ نظر کے حاملین امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ رائے روح شریعت اسلام سے قریب تر اور جدید بین الاقوامی حالات کے پیش نظر معتدل اور صائب ہے۔ دور جدید کے بین الاقوامی نظام کے تحت مختلف اقوام کے درمیان مسلسل مخاصمت، اور تنازعات کے تصفیہ کے لیے جنگ کو بطور مستقل وسیلہ کے قبول کرنا انتہائی خطرناک ہے۔ ذیل میں موخر الذکر رائے کے حق میں دلائل ذکر کیے جاتے ہیں:

قرآن کریم

اسلام میں جنگ ایک وسیلہ ہے اسلامی دعوت کی تکمیل اور اس کے لیے اسباب فراہم کرنے کا۔ اگر دعوت کے اسباب موجود ہیں اور ان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، مسلمانوں پر کہیں بھی مظالم نہیں ہو رہے اور وہ دنیا میں ہر جگہ اپنے دین کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے میں آزاد ہیں تو اس صورت میں جنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم کے جنگی احکامات کا استقصا کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کی بنیاد امن و سلامتی کو ٹھہراتا ہے، جنگ کو نہیں۔ قرآن میں ہے:

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ
عَلَى اللَّهِ (الأنفال ۶۱)

اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور خدا پر بھروسہ رکھو۔

قرآن نے امن عالم کی بنیاد رکھی ہے اور اس کی جملہ تعلیمات میں امن و سلامتی کے پیغامات ہیں۔ عالمی امن کی بنیاد اور سرچشمہ قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السَّلْمِ كَافَّةً
وَلَا تَتَّبِعُوا خُطَوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُبِينٌ (البقرہ ۲۰۸)

اے ایمان والو، اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

نیز فرمایا:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْفَىٰ إِلَيْكُمْ السَّلَامَ كَسْتُمْ

اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے، اسے فوراً نہ

مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمٌ كَثِيرَةٌ (النساء ۹۴)

کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اگر تم دنیوی فائدہ چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمہارے لیے بہت سی نعمتیں ہیں۔

غیر مسلموں سے تعلقات کی اصل 'امن' ہے۔ سورہ محمد کی آیت ۴: 'حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا' (تا آنکہ فریق مخالف لڑائی ترک کر کے ہتھیار رکھ دے) سے بھی اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اسلام میں جنگ دراصل ایک ضرورت ہے۔ قرآن کریم میں قتال کی جتنی آیات آئی ہیں، وہ ظلم و تعدی کے سیاق میں آئی ہیں۔ سب سے پہلی آیت جس میں ۲ ہجری میں جنگ کی اجازت دی گئی، یہ ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلِمُوا (الحج ۳۹)

جن مسلمانوں سے لڑائی کی جاتی ہے، ان کو اجازت ہے کہ وہ بھی لڑیں کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔

اس آیت میں واضح طور پر یہ قرار دیا گیا ہے کہ جنگ مسلمانوں کے اموال و انفس اور دیار و اوطان کے خلاف دشمن کی جارحیت کے بعد لازم ٹھہرائی گئی ہے یا مظلوموں کی اعانت کے لیے، کیونکہ ظاہر ہے کہ دفاع ہر انسان اور معاشرے اور قوم کا حق ہے۔ قرآن کریم نے اس مسئلے میں دوسری جگہ ان الفاظ میں رہنمائی کی ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا (البقرہ ۱۹۰)

اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں، تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑو، لیکن زیادتی نہ کرو۔

آیت کریمہ سے خالص دفاعی جنگ کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی سیاق میں ایک آیت کریمہ ہے:

فَإِنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ (البقرہ ۱۹۴)

اگر دشمن تمہارے خلاف زیادتی کرے تو تم جو اب میں ویسی ہی زیادتی اس کے خلاف کر سکتے ہو جیسی اس نے تمہارے خلاف کی ہے۔

اقدامی جہاد عملاً سیرت النبی ﷺ اور تاریخ اسلامی کے اوراق سے ثابت ہے لیکن اسی قدر کہ جب دشمن کی طرف سے جارحیت کا قصد ہو تو دفاع کے لیے پیش قدمی کی جائے۔ اس کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔

جنگ کی مشروعیت کا ایک اور سبب یہ ہے کہ فتنہ کی سرکوبی ہو، دعوت حق کے مقابلے میں کھڑی کی گئی رکاوٹوں کا انسداد ہو اور مسلمانوں کے عقیدہ کو متاثر کرنے والے مفسدات کا ازالہ ہو۔ قرآن نے اسے یوں بیان فرمایا ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (البقرہ ۱۹۳)

تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نابود ہو جائے اور ملک میں دین خدا ہی کے لیے ہو جائے۔

تاہم قرآن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے:

فَإِنْ أَنْتَهُوا فَلَا عُذْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ○
 اور اگر وہ فساد سے باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر
 زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔

قرآن کریم نے غیر محارب کفار اور محارب دشمن میں سے ان لوگوں کے بارے میں جو مسلمانوں کے معاملے
 میں اعتزال اور غیر جانبداری کا رویہ اختیار کریں، واضح طور پر ہدایت فرمائی ہے:

فَإِنْ اعْتَزَلُواكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُواكُمْ وَالْقَوْمَ إِلَيْكُمْ
 السَّلَامَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ○
 اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے کنارہ کشی اختیار کریں اور
 تم سے نہ لڑیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ
 بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی
 کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ (النساء: ۹۰)

آیت کریمہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جن قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات 'محاربہ' کے رہے ہوں، ان
 سے بھی ایک مرحلہ ایسا پیش آسکتا ہے کہ محاربہ کرنے والے محاربہ سے الگ ہو جائیں اور واقعی ایک ایسا تعلق قائم ہو
 جائے جس کو پرامن تعلقات کے دور کی ابتدا کہا جاسکے۔

قرآن نے کہیں بھی کفر کو وجہ جنگ کے طور پر بیان نہیں کیا نہ قرآن ہر اس قوم سے جو مسلمان نہیں، مستقل جنگی
 رویہ رکھنے کا حکم دیتا ہے بلکہ ان کے سلسلے میں پرامن بقائے باہمی کا اصول اور انسانیت دوستی کی تعلیم دیتا ہے:

لَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُواكُمْ فِي
 الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُواكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ
 تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
 الْمُقْسِطِينَ ○ (آیت ۸)
 جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں
 لڑی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا، ان کے ساتھ سلوک
 واحسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ
 تمہیں نہیں روکتا، بلکہ اللہ تو انصاف کرنے والوں کو پسند
 کرتا ہے۔

قرآن میں جہاد کا حکم اصلاً مقاتلین کے مقابلے میں دیا گیا ہے: 'وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ
 يُقَاتِلُواكُمْ' (اور تم اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑائی کرتے ہیں۔ البقرہ: ۱۹۰) یہ آیت جارح دشمن سے جنگ
 وجدال اور مقابلہ کو واجب ٹھہراتی ہے تاکہ ان کی دشمنی کا خاتمہ کیا جائے اور ان کے فتور کا ازالہ ممکن ہو۔ وہ دعوت حق کی
 راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کر سکیں اور دین اسلام سر بلند ہو۔

جن آیات میں مطلق طور پر جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مثلاً: 'وَأَقَاتِلُواهُمْ حَيْثُ تَقِفْتُمُوهُمْ' (ان کو جہاں پاؤ،
 قتل کر ڈالو۔ البقرہ: ۱۹۱) وہ بنیادی طور پر صرف اسلام دشمن مشرکین کے لیے تھا۔ مفسرین کے نزدیک یہ آیت عرب
 مشرکین کی بابت حکم بیان کرتی ہے جس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ اس قوم سے جزیہ، صلح، غلامی وغیرہ کی کوئی

صورت قبول نہیں کی جاتی جو نبی کی براہ راست مخاطب ہو چنانچہ ان کے لیے صرف اسلام یا تلوار کا انتخاب کرنا تھا۔

آیت کریمہ: 'مَالِكُمْ لَا تَقَاتِلُوْنَ' کی تفسیر میں علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

”جہاد کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ کمزور اور پست ہوئے مسلمانوں کو ان کافروں اور مشرکوں کے بچہء استبداد

سے چھڑایا جائے جو ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے اور ان کو ان کے دین سے انحراف پر مجبور کرتے ہیں

چنانچہ جہاد فرض کیا گیا تاکہ دین کو غالب کیا جائے اور مظلوموں کی اعانت کی جائے۔“

قرآن نے جہاں ہمہ وقت مستعد رہنے اور مادی ترقی اور جہد مسلسل کی تعلیم دی ہے تو وہ اس لیے نہیں کہ اس

سے ساری دنیا کو فتح کیا جائے یا انہیں اسلحے کے زور سے مسلمان کیا جائے یا جملہ اقوام عالم پر غلبہ پالیا جائے بلکہ اس

لیے کہ کوئی انہیں کمزور سمجھ کر ہم جونی کرنے کی جرات نہ کرے اور مسلمان کمزور قوم نہ رہیں۔

غرض قرآن کریم نے جہاد کو ایک ضرورت، ایک وسیلہ اور ذریعہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ وسیلہ کو مقصد بنانا

قرآنی تعلیمات کے علاوہ عقل عام اور منطق سلیم کے بھی منافی ہے۔

احادیث و سیرت رسول ﷺ

احادیث رسول مسلم ریاست کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں ”حالت امن“ کے اصل ہونے پر دلالت

کرتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لا تتمنوا لقاء العدو و سلوا الله العافية

(صحیح البخاری، الجہاد و السیر، ۲۷۴)

دشمن سے ٹڈ بھڑکی از خود تمنا نہ کرو اور اللہ سے عافیت ہی

کی دعا کرو۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے قتال کی حیثیت اور غایت کو عدل، حق اور دعوت اسلام کے دائرہ میں متعین کر دیا ہے:

من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو

فی سبيل الله (صحیح البخاری، الجہاد و السیر،

وہ ہے جو صرف اور صرف اللہ کے کلمے کی بلندی کی خاطر

(۲۵۹۹)

جنگ کرے۔

جہاد اسلام کا امتیازی وصف اور قول رسول ﷺ کی بدولت عمارت اسلام کا سب سے اونچا کنگرا ہے۔ (سنن

الترمذی، الایمان، ۲۵۴۱) جہاد قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ اس کو کسی ظالم کا ظلم ختم کر سکتا ہے اور نہ کسی عادل کا

عدل۔ (سنن ابی داؤد، الجہاد، ۲۱۷۰) مگر یہاں دو نکات قابل غور ہیں: ایک یہ کہ اسلامی لٹریچر میں جہاد ایک وسیع

مفہوم رکھتا ہے جس کا اطلاق قتال کے علاوہ جدوجہد کے دیگر طریقوں پر بھی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس مضمون کی

احادیث میں ’جہاد‘ بمعنی سعی و جہد کی اہمیت کا بیان مقصود ہے جو قتال کی مخصوص صورت صرف اس حالت میں اختیار

کرنے گا جب اس کے اسباب یعنی جارحیت، ظلم، افساد و عقیدہ وغیرہ پائے جائیں گے۔

اس ضمن میں حدیث رسول ﷺ: 'امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الہ الا اللہ' (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک قتال کرتا رہوں جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہ کر لیں) (صحیح البخاری، الایمان، ۲۴) سے استدلال کرتے ہوئے غیر مسلم اقوام سے تعلقات کی اصل بنیاد جنگ کو نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ اس کی بابت علما کا اجماع ہے کہ اس سے بطور خاص مشرکین عرب ہی مراد ہیں۔

اسلام نے جنگ کی اجازت اشاعت اسلام کے تقریباً پندرہ سال گزر جانے کے بعد یعنی ۲ ہجری میں۔ ان پندرہ سالوں میں کوئی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی جس میں جنگ کی ترغیب دی گئی ہو۔ رسول اکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں تیرہ برس غیر مسلموں سے تعلقات کے اعتبار سے حالت امن میں رہے۔ مدینہ میں بھی دعوت حق کا آغاز حالت امن ہی میں ہوا مگر جب مشرکین نے جارحیت کی تو یہ حالت امن، حالت جنگ میں تبدیل ہو گئی کہ اب اسلامی مملکت اور مسلمانوں کا دفاع ناگزیر ہو گیا تھا۔

نبی اکرم ﷺ نے تقریباً ۲۷ غزوات لڑے اور ان کے علاوہ کئی سرایا بھی بھیجے۔ غزوات نبوی اور سرایا کا تاریخی منظر نامہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ غزوات و سرایا اذیت، تعذیب، دشمنی، مسلمانوں کو ان کے دیار و اوطان سے نکالے جانے، ان کو ان کے دین سے منحرف کرنے کی مساعی، دین حق کی اشاعت میں رکاوٹ، ضرب و شتم اور ظلم و تعدی جیسے اسباب کی بنا پر وقوع پذیر ہوئے تھے یا پھر دشمن کے ارادہ جارحیت کے ازالہ کی خاطر۔ کوئی راستہ ان سے چھٹکارے کا نہیں تھا ورنہ حضور اکرم ﷺ حالت امن کو برقرار رکھتے اور دست شفقت تلوار نہ اٹھاتا کیونکہ آپ کو جب بھی موقع ملا کہ بغیر تلوار اٹھائے اسلام کے مقاصد حاصل کیے جاسکیں، آپ نے جنگ سے گریز کیا اور خون بہائے بغیر اپنا مقصد پورا کیا۔

صدر اول کی جنگی تاریخ گواہ ہے کہ بدر، احد، خندق، یوم الرجیع اور بزمعونہ کے واقعات دشمن کی جارحیت کے مسببات تھے۔ جارحیت کا یہ سلسلہ حدیبیہ کا تاریخی معاہدہ طے پا جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ:

- قبیلہ ہوازن، بنو ثقیف اور دوسرے قبائل کے ساتھ جارحیت کے لیے بڑھا تو آپ نے ان سے جنگ کی۔
- ہجرت کے بعد یہود نے معاہدہ توڑا۔ بنو قینقاع کو بدر میں مسلمانوں کی فتح ہضم نہ ہوئی۔ انہوں نے بغاوت اور حسد کی بنا پر رئیس المنافقین ابن ابی سے مخالفت کر لی، ایک مسلم خاتون کی بے حرمتی کی اور اس کے محافظ مسلمان کو قتل کیا اور پھر یہ بدتمیزی اور بے عقلی بھی کہ رسول اکرم ﷺ کو یوں مخاطب کیا: 'لا یغرنک انک

لقیت قوما لا علم لهم بالحرب، (آپ کو نا تجربہ کار لوگوں سے جنگ جیتنا دھوکے میں مبتلا نہ کر دے۔ ہم سے جنگ کریں گے تو پتہ چلے گا کہ مردوں سے جنگ کرنا کیا ہوتا ہے) پھر باقاعدہ نقض عہد کر کے قلعہ بند ہو گئے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا اور پھر انہیں مدینہ سے نکال دیا گیا۔

○ بنو نضیر نے رسول اللہ ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا۔ آپ کو وحی الہی سے خبر ہو گئی۔ ان کے قلعوں کا محاصرہ ہوا اور بالآخر انہیں مدینہ سے نکالا گیا۔

○ بنو قریظہ کو قرآن نے ان کی بد عہدی اور نقض عہد کی بنا پر گندا اور شریر کہا ہے۔ غزوہ خندق میں انہوں نے مشرکین مکہ سے محالفت کی اور بدر میں بھی انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ان کی اعانت کی۔ ان کے نقض عہد کی بنا پر انہیں قتل کیا گیا۔

○ یہود خیبر سے جنگ کی بنا بھی ان کا نقض عہد ہی تھی۔

○ روم و فارس سے صحابہ کرام کی جنگیں بھی ان کی طرف سے ”حالت امن“ کو متاثر کرنے کی بنا پر لڑی گئیں۔ یہ دونوں اسلام کے پیغام کو ٹھکراتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہوئے۔ کسراے ایران نے تو نبی اکرم ﷺ کے مکتوب گرامی کو چاک کیا اور یمن کے گورنر باذان کے توسط سے آپ ﷺ کی گرفتاری کے لیے دو آدمیوں کو روانہ کیا۔

یہ تمام فتوحات اور معرکے عدوان (جارحانہ روش)، طغیان (استبداد)، فساد (کریپشن) اور اسراف (تجاوز عن الحد) کے خلاف برپا ہوئے اور پھر جب دشمن کی طرف سے صلح، جزیہ، اطاعت یا غیر جانبداری کی صورت نظر آئی تو ”جنگ“ ختم ہو گئی اور حالت امن نے قرار پکڑ لیا کیونکہ اسلام میں جنگ انتقام اور کسی کی ذاتی خواہش کی تکمیل کا نام نہیں:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنَ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا (المائدہ ۲)

اور ایک گروہ نے جو تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا، تو یہ بات تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر (ناروا) زیادتی کرنے لگو۔

اور نہ تو وسیع پسند کے جذبہ کی تسکین، استعماری نظام کے قیام یا اقوام عالم کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلْهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (القصص ۸۳)

یہ عالم آخرت تو ہم انہیں لوگوں کے لیے خاص کر دیتے ہیں جو زمین پر نہ بڑا بننا چاہتے ہیں نہ فساد کرنا۔ اور نیک انجام تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

اس بات کو دوسرے مقام پر قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

———— ماہنامہ الشریعہ (۲۲) جولائی ۲۰۰۳ء ————

جزاء لقتالہم و مسبب عنہ۔ یعنی ”آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں جنگ کا حکم ان کے جنگ کرنے کے مقابلے کے طور پر دیا گیا ہے اور ان کا جنگ کرنا ہی ہمارے جنگ کرنے کا سبب ہے۔“

البقرہ کی آیت ۱۹۳: ”وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً“ (ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ کی سرکوبی ہو جائے) کے تحت لکھتے ہیں: ”ان لا تكون فتنه منهم للمسلمين عن دينهم بالاكرام بالضرب والقتل“۔ یعنی ”ان کا مسلمانوں کو ان کے دین کے معاملے میں مار پیٹ اور قتل و ظلم کے ساتھ پریشان کرنے کا انسداد ہو جائے۔“ گویا جنگ صرف مخصوص اسباب کی موجودگی تک باقی رہتی ہے۔

ابن ہمام حنفی نے یہ بھی بتایا ہے: ”المقصود من القتال هو اخلاء العالم من الفساد“۔ ”قتال کا مقصود زمین سے فساد کا خاتمہ کرنا ہے۔“

ابن قیم نے فرمایا: ”وفرض القتال على المسلمين لمن قاتلهم دون من لم يقاتلهم“۔ ”مسلمانوں پر قتال ان لوگوں کے خلاف فرض کیا گیا ہے جو ان سے لڑتے ہیں نہ کہ ان کے خلاف جو ان سے نہیں لڑتے۔“

احناف کے امام سرحسی نے جنگ کا مقصود یہ بیان فرمایا ہے: ”والمقصود ان يامن المسلمون ويتمكنوا من القيام بمصالح دينهم و دنياهم، یعنی ”جہاد کا ہدف اور مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو امن و سکون میسر ہو اور وہ اپنے دینی اور دنیاوی مقاصد کی تکمیل امن کے ساتھ کر سکیں۔“

گویا جہاد ان مقاصد کے حصول کے لیے ہے کہ مسلمان اور ان کے ہم وطن لوگ امن و امان سے رہ سکیں، مسلمانوں کے دینی مقاصد پورے ہو رہے ہوں اور ان کے دنیوی مصالح کی تکمیل ہو رہی ہو۔ اگر یہ مقاصد جنگ کی نوبت آئے بغیر ہی پورے ہو جائیں تو جنگ کرنا ناجائز ہے۔

معنی المحتاج میں ہے: ”وجوب الجهاد وجوب الوسائل لا المقاصد واما قتل الكفار فليس بمقصود حتى لو امكن الهداية باقامة الدليل بغير جهاد كان اولى من الجهاد، یعنی ”جہاد کا وجوب دراصل وسائل کی نوعیت کا ہے، مقاصد کی نوعیت کا نہیں۔ رہا کفار کا قتل کرنا تو وہ بھی مقصود نہیں چنانچہ اگر ہدایت جہاد کے بغیر محض اقامت دلیل ہی سے ممکن ہو تو یہ بات جنگ کی نسبت خوب تر ہے۔“

فقہاء کے ان اقوال کی روشنی میں مسلم اور غیر مسلم سلطنتوں کے مابین تعلقات کی اساس کے طور پر جنگ کا ایک عارضی کیفیت ہونا اور حالت امن کا مستقل حالت ہونا الم نشرح ہو جاتا ہے۔

مذکورہ دلائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلم ریاست کے غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات کی بنیاد امن ہے چنانچہ جنگ صرف اس صورت میں جائز ہوگی جب دشمن کی جارحیت کا سامنا ہو، مسلم مبلغین کو تبلیغ دین سے روکا جائے یا

مسلمانوں اور اسلام کی حرمت پر زد پڑتی ہو تو اس صورت میں جان و مال اور عقیدہ کے تحفظ کے لیے جنگ ایک ضرورت ہوگی۔

حرف آخر

تعلقات بین الاقوام کا اسلامی نظریہ اور فلسفہ عصر حاضر کے لیے موزوں واحد فلسفہ امن ہے۔ حق یہ ہے کہ صرف اسی طرح کا فلسفہ اور انداز فکر انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب اور باہم مربوط کر سکتا ہے اور اقوام عالم کے مذہبی، ثقافتی، عمرانی اور اقتصادی تنوعات اور امتیازات کو تسلیم کرتے ہوئے مقاصد، اقدار، فلاح اور مفاہمت کے وسیع اور مشترک انسانی دائرے تشکیل دے سکتا ہے۔ امت مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں اپنے دشمنوں کی تعداد کم سے کم کرے اور قوموں کے ساتھ باہمی احترام پر مبنی صلح اور امن و سلامتی کے تعلقات کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے۔

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ لفظ 'اسلام' کا مادہ ہی سلامتی اور امن کا معنی دیتا ہے۔ 'مسلم' بھی سلامتی اور امن پھیلانے والے کو کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا شعار (Slogan) اور شناخت بھی امن و سلامتی ہے۔ اللہ تعالیٰ 'سلام' ہیں، پیغمبر اسلام پیغمبر امن و سلام ہیں اور حیات انسانی امن کے ساتھ ہی پھل پھول سکتی ہے۔

مراجعہ و ماخذ

۱۔ ابو بکر الجصاص: احکام القرآن، ۲۔ قرطبی: الجامع لاحکام القرآن، ۳۔ وہبہ زحیلی: آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، ۴۔ ایضاً: العلاقات الدولیة فی الاسلام، ۵۔ سید رمضان البوطی: الجہاد فی الاسلام، ۶۔ ابن رشد: بدایۃ المجتہد، ۷۔ السرخسی: المبسوط، ۸۔ ایضاً: شرح السیر الکبیر، ۹۔ النووی: معنی المحتاج، ۱۰۔ عبد الحمید احمد ابوسلیمان: اسلام اور بین الاقوامی تصورات، ۱۱۔ د۔ محمد حمید اللہ: خطبات بہاولپور، ۱۲۔ د۔ محمد احمد غازی: خطبات بہاول پور، ۱۳۔ مجید خدوری: Islamic Law of Nation، ۱۴۔ راغب الاصفہانی: مفردات القرآن، ۱۵۔ اشرف علی تھانوی: بیان القرآن